ڈاکٹر محمد آصف

اسلامی اور مغربی تہذیبوں کے مابین مکالمے کی اہمیت وضرورت

(اقبال کے افکار کی روشنی میں ایک مطالعہ)

اقبال کے نزدیک مغرب کا جدید انسان خالصتاً کاروباری یا بیوپاری معاشرے کی پیداوار ہے اور مادی ترقی کا ماحصل ہے۔ مادی ترقی کا یہ تصور (یعنی بحیثیت مجموعی انفرادی طور پر اپنی پیداوار کو بڑھاتے چلے جانا اور اپنی انفرادی آمدنی میں مسلسل اضافہ کرنا) جدید مادہ پرست صنعتی مغرب کی اختراع ہے۔ اس ترقی کے نتیجے میں جو تبدیلی ذہنیت میں یا طریق حیات کے متعلق انسان کے زاویۂ نگاہ میں پیدا ہوئی، مغرب کا جدید انسان اس کا مظہر ہے۔ ترقی کے اس [redacted] تصور کا تعلق اس سلسلۂ ارتقا سے ہے جو یورپ میں احیائے علوم سے لے کر صنعتی انقلاب تک جاری رہا۔ اس دوران مغرب نے رفتہ رفتہ ساری دنیا کو تجارتی منڈی میں تبدیل کر دیا۔ جس کے نتیجے میں جدید مغرب کا بیوپاری معاشرہ وجود میں آیا۔ ارتقا کے سبب مادی نوعیت کی بہت سی تبدیلیاں اس معاشرے میں پیدا ہوئیں۔ تاجروں نے تجارت کی آزادیاں حاصل کر کے سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد رکھی۔ سرمایہ دارانہ نظام کی کوکھ سے ملوکیت و استعمار نے جنم لیا۔ پیداوار کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت نے مغربی اقوام میں دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کا جنون پیدا کر دیا۔ پسماندہ اقوام (جن میں مسلمان بھی شامل ہیں)، (افریقہ، ایشیا، لاطینی امریکہ) کا

استحصال شروع ہوا۔ پسماندہ اقوام مغلوب ہوئیں نوآبادیات قائم ہوگئیں۔ ان نوآبادیات سے خام مال سستے داموں حاصل کیا جاتا اور بعدازاں مشینوں سے اسے تعمیری بنا کر انہی مغلوب اقوام کے ہاتھوں مہنگے داموں فروخت کردیا جاتا۔ یوں پسماندہ اقوام کے کروڑوں انسان سیاسی اور معاشی استحصال کا شکار ہوئے۔ انہی سامراجی اقتصادی ضروریات نے یورپی طاقتوں کو دنیائے اسلام کی طرف متوجہ کیا۔ ٹائن بی (Toynbee) کے بقول بالخصوص تیل کے ذخائر کی وجہ سے (اٹھارہویں صدی ہی سے) عالمِ اسلام اقتصادی لحاظ سے بے حد سودمند قرار پایا۔ تیل کے ذخائر اور اپنی جغرافیائی اہمیت کی وجہ سے دنیائے اسلام عالمگیر وسائلِ حمل ونقل کا مرکز بن گئی۔ تیل کے ذخائر کی وجہ سے جو کشمکش اور تناؤ کی کیفیت پیدا ہوئی تھی اس میں اضافہ جغرافیائی اہمیت اور وسائلِ نقل وحمل کا مرکز بن جانے کی وجہ سے بھی ہوا۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ ہزاروں تہذیبی، سیاسی، اقتصادی قوتیں عالمِ اسلام کے دروازوں پر دستک دے رہی ہیں اور خلیج کی جنگ کے بعد سے تو ہنٹنگٹن (Huntington) کے بقول خلیج فارس امریکی جھیل بن چکا ہے۔ غرض مغرب کا بیوپاری معاشرہ پسماندہ اقوام (عالمِ اسلام، اقوامِ مشرق، جنوب، تیسری دنیا) کی لوٹ کھسوٹ کے نتیجے میں آسودہ حال اور متمول ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ ایک ترقی یافتہ معاشرہ بن گیا۔ مغرب کے نوآبادیاتی نظام کے مظالم کا یہ سلسلہ اب تک رنگ روپ بدل کر جاری ہے۔ ان اقتصادی خودغرضیوں نے خود اقوامِ مغرب کو بھی جنگ وجدل کی بھٹی میں جھونکے رکھا۔ جس کے نتیجے میں ساری دنیا پہلی جنگِ عظیم اور دوسری جنگِ عظیم کی تباہ کاریوں کا نشانہ بنی۔ انہی خودغرضیوں کے سبب روسی استعمار اور یورپی استعمار یا سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت میں کشمکش اقبال ہی کے دور میں پیدا ہوئی۔ اقبال کی وفات کے بعد اس کشمکش نے دو نظریاتی بلاکس کی صورت اختیار کر کے سرد جنگ کی فضا پیدا کردی۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد سے مغربی تہذیب کی قیادت امریکا کے پاس ہے۔ سرد جنگ کے اختتام پر، اشتراکیت کی شکست کے بعد سے مغربی تہذیب اور اس کا پیدا کردہ سرمایہ دارانہ نظام امریکا کی رہبری میں دنیا کی واحد طاقتور تہذیب اور نظام کی صورت میں موجود ہے۔ امریکا تمام دنیا میں واحد سپر پاور کی حیثیت اختیار

کر چکا ہے۔ اسے مغربی تہذیب کے لیڈر کی حیثیت حاصل ہے۔ اب دنیا یک قطبی دنیا کہلاتی ہے اور وہ اپنی استعماری قوت کو فروغ دینے کے لیے نیو ورلڈ آرڈر (نیا عالمی نظام) اور آفاقی تہذیب نافذ کرنے کی فکر میں ہے۔ اسلام اس کے نزدیک ایک سنگین خطرے کی صورت میں اس کے بالمقابل موجود ہے۔ پس اقبال کے نزدیک عہدِ جدید کا مغربی انسان ایک نیا انسان ہے جس کے ذہنی رجحانات نئے ہیں۔ اسے صحیح طور پر صنعتی، یک طرفہ، تنہا، ٹیکنیکل، مادہ پرست انسان کہا جاسکتا ہے۔ اقبال کے نزدیک ایسے انسانوں پر مشتمل معاشروں اور تہذیبوں کا ایمان فقط سیاسی و اقتصادی قوت میں اضافہ کرتے چلے جانا ہے۔ یہ معاشرہ اور یہ انسان سائنس اور ٹیکنالوجی کی حاکمیت کو تسلیم کرتا ہے جس کی وہ خود پیداوار ہے۔ وہ سیکولر ہے اور معاملات کو محض دنیادارانہ انداز میں سلجھانے کا قائل ہے۔ وہ زندگی میں محض مادی اور جسمانی ذرائع سے مسرت کشید کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ وہ انفرادی عقلیت پر یقین رکھتا ہے، خودغرض ہے اور تہذیبی تکبر اور ''خبطِ عظمت'' میں مبتلا ہے۔(۱) مغرب کے اس جدید انسان اور جدید معاشرے کے بارے میں اقبال نے اپنے خطبے ''کیا مذہب کا امکان ہے؟'' میں اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے:

''عصر حاضر کی سرگرمیوں سے جو نتائج مرتب ہوئے ہیں ان کے زیر اثر انسان کی روح مردہ ہو چکی ہے۔ یعنی وہ اپنے ضمیر اور باطن سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ خیالات اور تصورات کی جہت سے دیکھیے تو اس کا وجود خود اپنی ذات سے متصادم ہے۔ سیاسی اعتبار سے نظر ڈالیے تو افراد افراد سے۔ اس میں اتنی سکت ہی نہیں کہ اپنی بے رحم انانیت اور ناقابل تسکین جوعِ زر پر قابو حاصل کر سکے۔ یہ باتیں ہیں جن کے زیر اثر زندگی کے اعلیٰ مراتب کے لیے اس کی جدوجہد بتدریج ختم ہو رہی ہے۔''(۲)

صدیوں کے اس تاریخی عمل میں مسلمانوں کا کردار یہ ہے کہ وہ وسائل کی دولت سے مالا مال ہونے کے باوجود معاشی، عسکری، صنعتی ترقی کے اعتبار سے بے حد پسماندہ ہیں۔ ملوکیت، مُلّائیت اور خانقاہیت کی وجہ سے پیدا شدہ اس جمود کو اقبال نے ''پانچ سو برس کے جمود'' کا زمانہ قرار دیا ہے۔ چونکہ مسلمان پسماندہ اقوام میں شامل ہیں اس لیے ان کو اپنا

معیارِ زندگی بلند کرنے کی خاطر اپنا انحصار مغرب یا ترقی یافتہ اقوام پر کرنا پڑتا ہے اور اسی لیے وہ سیاسی آزادی کے باوجود اقتصادی اور ٹیکنیکی طور پر مغربی نو آبادیاتی نظام کے شکنجے میں گرفتار ہیں۔ آج دنیا میں کسی قوم کے لیے ترقی اسی وقت ممکن ہے جب وہ صنعتی طور پر مستحکم ہو اور اقتصادی و ٹیکنیکی طور پر ترقی یافتہ ہو۔ صنعتی انقلاب کے بعد سے تو بالخصوص دنیا اپنے سیاسی انتظامات معاشی مفادات کے تحت استوار کرتی رہی ہے اور اکیسویں صدی تو ہے ہی معاشی تقابل کی صدی۔ بحیثیت مجموعی مغربی اقوام صنعتی، معاشی اور ٹیکنیکی اعتبار سے ترقی یافتہ ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ دیگر پسماندہ اقوام کی طرح مسلمان بھی سیاسی، معاشی اور علمی اعتبار سے مغرب کے زیر بار ہیں۔ مغرب کی ترقی یافتہ اقوام نے اپنی اقتصادی سیاسی اور ٹیکنیکی حاکمیت کو برقرار رکھنے کے لیے انہیں مسلسل قرضوں کے بوجھ تلے دبایا ہوا ہے۔ اقبال نے جو سوال بیسویں صدی کے ابتدائی نصف میں اٹھائے تھے وہ آج اکیسویں صدی میں بھی موجود ہیں۔ مغرب اپنی ٹیکنیکی اور علمی قوت کے بل بوتے پر آج بھی مسلم دنیا کے قوت کے ذخائر پر اپنی حاکمیت قائم کرنے کے لیے نئے عالمی نظام کی آبیاری کر رہا ہے اور مسلسل اپنے سامراجی استعماری نظام کو مستحکم کرنے میں مصروف ہے جبکہ اسلامی مشرق نہ ''افغانی'' کے افکار پر دھیان دے رہا ہے نہ ''سعید حلیم پاشا'' کے اور نہ ''اقبال'' کے۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ مغرب کے نزدیک تمام مغربی قوتوں کو اسلام سے تصادم کا خطرہ ہے اس لیے اب اسلام ہی ان کا خاص ہدف ہے جس کا احساس دلانے کی کوشش اقبال نے ۱۹۳۶ء میں ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں کی تھی۔ اس جدید سیاسی تہذیبی فکر کا ماحصل یہ ہے کہ سویت یونین کی شکست و ریخت کے بعد اگلا نظریاتی چیلنج اسلام ہے۔ اسلام اور مغرب دو مختلف تہذیبیں ہیں۔ انسان دوستی، آزاد خیالی، جمہوریت پسندی، حقوقِ انسانی، آزادی، قانون کی بالادستی، آزاد تجارت اور کلیسا و ریاست کی علیحدگی جیسی روایات اسلامی (اور چینی) تہذیبوں میں موجود نہیں اس لیے وہ مغربی تہذیب سے متصادم ہو سکتی ہے۔ اس سیاسی تجزیے کا اہم پہلو یہ بھی ہے کہ چونکہ مغربی دنیا نئے ورلڈ آرڈر پر عمل پیرا ہے اس لیے اس کے مقابلے میں ممکنہ اسلامی بلاک مغربی تہذیب اور اس کے مفادات

لیے وہ گرفتار ہو اور سیاسی معاشی ہیں۔ ر سے یت کو سوال ہیں۔ پر اپنی مراجی ھیان غرب خاص) یں کی ندا گلا خیالی، ت کی ے سے ڈر پر ادات

کے لیے راستے کا پتھر ثابت ہوسکتا ہے۔ چنانچہ آج امریکا کے معاشی اور عسکری دباؤ میں تمام مسلمان ممالک پس رہے ہیں۔ اسے صلیبی جنگوں کا نام دیا جائے یا نہ دیا جائے امریکا کی رفتار و گفتار سے یہ ضرور واضح ہوتا ہے کہ اس کی پالیسیاں منافقانہ روّیوں پر مبنی ہیں اور مسلمانوں کے خلاف ہیں جس کی واضح دلیل اسرائیل ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مشرقِ وسطیٰ کا نقشہ بدل دینا چاہتا ہے اور اس کا پہلا ہدف معدنی تیل پر قبضہ کو مستحکم کرنا ہے۔ مسلمان ممالک کی مشکل یہ ہے کہ ان کے وسائل ان کے اختیار میں نہیں ہیں۔ مسلمانوں کا دیس ان کا دیس ہونے کے باوجود ان کا نہیں ہے۔ کہنے کو سب مسلمان ممالک آزاد اور خودمختار ہیں مگر یہ آزادی اور خودمختاری کسی نہ کسی طور مغرب کی مٹھی میں بند ہے۔ کہیں قرضوں کے ذریعے، کہیں سیاست کے ذریعے، کہیں آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کی معاشی امداد کے ذریعے۔ اقبال نے مغرب کے اس جدید استحصالی نظام کی عیاری مکاری اور ابلیسی طریق کار کا ادراک تقریباً ستر سال قبل کرلیا تھا جو آج اسلامی تشخص کو درہم برہم کرنے میں شدت سے کوشاں ہے۔ اقبال نے اپنے احساس کا اظہار ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں بھی کیا ہے اور اپنی اُس نظم میں بھی جس کا عنوان ہے ''ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام''۔

لا کر برہمنوں کو سیاست کے پیچ میں — زناریوں کو دیرِ کہن سے نکال دو
وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا — روحِ محمد اُس کے بدن سے نکال دو
فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات — اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو
افغانیوں کی غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج — مُلّا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو
اہلِ حرم سے ان کی روایات چھین لو — آہُو کو مرغزارِ خُتن سے نکال دو

(ضربِ کلیم/کلیاتِ اقبال اردو، ص ۶۵۸/۱۵۸)

چنانچہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں بھی بنیادی طور پر مسلم ممالک کا محاصرہ کیا جارہا ہے۔ پاکستان کی ایٹمی صلاحیت کو محض اِس بنا پر ''اسلامی بم'' قرار دیا گیا کہ ان کو یہ خوف لاحق ہے کہ اگر یہ ایٹمی صلاحیت کسی نہ کسی طرح ایران، عراق، (سابقہ) یا لیبیا کو منتقل ہوگئی تو

یقیناً اسے اسرائیل کے خلاف استعمال کیا جائے گا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ خود اسرائیل کے پاس ایک سو سے زائد ایٹم بم موجود ہیں جن کے ذریعے وہ اسلامی دنیا کے تمام بڑے بڑے شہروں کو نیست و نابود کرسکتا ہے۔(۳)

مغرب کو دنیا میں ''نیوکلیئر پھیلاؤ'' کا خدشہ ہے جس کی وجہ سے وہ مسلمانوں کو پسماندہ اقوام کو نیوکلیئر ٹیکنالوجی کے حصول کی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن خود ان کے پاس ایٹمی ہتھیاروں کے اونچے ڈھیر ہیں۔ نیوکلیئر ہتھیار بنانے والی اقوام سات سمجھی جاتی ہیں۔(ان میں صرف ایک اسلامی ملک پاکستان ہے) نیوکلیئر پھیلاؤ میں اس اضافے کو اُفقی اضافہ کہا جاتا ہے جو یقیناً قابل ذکر نہیں اور عالمِ اسلام کے حوالے سے تو ناقابل بیان ہے۔ لیکن عمودی اضافہ (یعنی ایٹمی ہتھیاروں کی تعداد اور ایٹمی صلاحیت کی مقدار میں اضافہ) کا عالم یہ ہے کہ ۱۹۸۵ء تک نیوکلیئر ہتھیار بنانے والی ترقی یافتہ اقوام کے پاس ان ہتھیاروں کی تعداد تقریباً پچاس ہزار تھی اور ان کی قوتِ دھما کا ایک ہزار ہیروشیما بموں کے برابر تصور کی جاتی ہے۔ گویا کرۂ ارض کے ہر باشندے کے لیے چار ٹن ٹی این ٹی دھماکے کے برابر۔ سو انسانیت کے لیے خطرہ اُفقی اضافہ نہیں عمودی اضافہ ہے۔(۴) اور یہ ترقی یافتہ اقوام اور مغرب کی منافقانہ پالیسیوں کی واضح دلیل ہے۔ امریکی قوم جس کی آبادی کل آبادی کا صرف چھ فیصد ہے دنیا بھر کی چھتیس فیصد توانائی اکیلے استعمال کرتی ہے اس کے مقابلے میں پسماندہ اقوام جن میں مسلمان بھی شامل ہیں، کی آبادی کرۂ ارض پر کل آبادی کا تہتر فیصد ہے مگر وہ دنیا بھر کی صرف دس فیصد توانائی استعمال کرتی ہیں۔ ان حقائق کے پس منظر میں پسماندہ اقوام کا حق ہے کہ وہ ترقی کی تحصیل کی خاطر وافر توانائی پیدا کرنے کے لیے نیوکلیئر ٹیکنالوجی استعمال میں لائیں۔(۵) لیکن ترقی یافتہ اقوام نے اور مغرب نے اپنی منافقانہ پالیسیوں کے ذریعے اس عدم توازن کو برقرار رکھا ہوا ہے۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں استحصال سے نجات کا شعور بھی پیدا ہوا ہے اور آزادی کی تحریکیں بھی کارفرما ہیں۔

مغربی تہذیب آج امریکا کی قیادت میں ایک زبردست تہذیبی تکبر'' خبطِ عظمت

اور آفاقیت کے جنون میں مبتلا ہے اور اس کے سامنے ہنٹنگٹن کا فکری زاویہ رہنما اصول کے طور پر موجود ہے کہ دنیا کی تمام تہذیبیں جس اکیلی اور توانا تہذیب سے ٹکرا رہی ہیں وہ جدید مغربی تہذیب ہے۔ گویا انسانی عظمت کا معیار صرف مغربی تہذیب ہے جسے اسلامی تہذیب سے خطرہ ہے۔ مغرب کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی برتری کی حفاظت کرے۔ اس طرح تہذیبی کشمکش کا یہ نظریہ تہذیبوں کے تصادم اور بالآخر مغربی سامراجیت کے غلبے پر دلالت کرتا ہے۔ اس کی بنیاد فوکویاما نے مہیا کی ہے جس کے تحت سرد جنگ کے خاتمے کے بعد اب دنیا کے سامنے فلاح کا راستہ صرف ایک ہی ہے یعنی مغربی لبرل جمہوریت اور آزاد تجارت بالفاظِ دیگر مغربی تہذیب۔(۶)

امریکا کی آفاقی نو آبادیاتی نظام کی خواہش اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ دنیا کو ایک اخلاقی، انسانیت نواز اور مساوات پر مبنی نظام کی ضرورت ہے جس میں بالخصوص اسلام اور اہلِ اسلام کی شدت پسندی اور جہالت راستے کی رکاوٹ ہے۔ مغربی تمدن کی اس جارحانہ و آمرانہ خواہشات کی بدولت آج بالعموم تمام انسانیت اور بالخصوص تمام مسلمان نہایت ہی نازک مقام پر کھڑے ہیں۔ مغرب کی نام نہاد تہذیب یافتہ اقوام تیسری دنیا بالخصوص مسلمان اقوام کے ساتھ جو سلوک کر رہی ہیں وہ ان کی وحشیانہ خواہشات اور بہیمت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ عالمی اقتصادی اور سیاسی بحرانوں نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ اشتراکیت کی طرح مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام اور مغربی تہذیب کے آفاقیت پر مبنی دعوے بھی امن وامان اور یکجہتی کی فضا پیدا کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ اس کے برعکس ایسا مرحلہ آ چکا ہے کہ کسی بھی وقت کوئی آگ بھڑک سکتی ہے۔ آج انسانیت نواز مفکرین اور سیاسی مبصرین ایسے اقتصادی اور سیاسی عالمی نظام پر زور دے رہے ہیں جس کی بنیاد احترامِ آدمیت پر ہو۔ جس میں مختلف تہذیبیں اور ان سے وابستہ اقوام مل جل کر رہیں۔ جہاں تصادم کی بجائے اشتراکِ عمل کی فضا قائم ہو۔ آج نہ صرف اسلام اور مغرب میں موجود تناؤ کی کیفیت کا حل بلکہ تمام انسانیت کی بقا کا حل اتحادِ انسانیت میں مضمر ہے۔ یہ وہی خیالات ہیں جو نصف صدی پیشتر اقبال نے پیش کر رکھے ہیں۔

آدمیّت احترامِ آدمی باخبر شو از مقامِ آدمی

(جاوید نامہ/کلیاتِ اقبال اردو، ص ۲۰۵/۷۹۳)

یہ احترامِ آدمیت اور وحدتِ انسانی وہ ہے جسے مغرب کی سامراجی سیاست اور نو آبادیاتی آفاقیت و عالمگیریت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ انسانی اتحاد و آفاقیت تہذیبی تصادم، انسانی وحدتوں کی تخریب و تباہی اور اسلامی و مغربی تہذیبی بحران پر دلالت نہیں کرتی بلکہ صحیح معنوں میں انسانیت اور احترامِ آدمیت کی بنیادوں پر ایک مشترکہ بین الاقوامی برادری کی تشکیل کرتی ہے۔ آج نہ صرف اسلام اور مغرب کے درمیان مکالمے اور یگانگت و اشتراک کے لیے، بلکہ تمام اقوامِ عالم کے لیے اس انسانی نقطۂ نظر کی ضرورت ہے نہ کہ مغرب کے مادی اور سرمایہ دارانہ نقطۂ نظر کی۔ اس سلسلے میں ''اقبال کا سالِ نو کا پیغام'' (یکم جنوری ۱۹۳۸ء) ان کی تہذیبی فکر کا نچوڑ ہے۔ اسے اگر آج کے عالمی واقعات، اسلام اور مغرب کے حالات و حادثات اور بین الاقوامی تناظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اقبال موجودہ حالات کو سامنے رکھ کر اپنی بات کہہ رہے ہیں۔ اس کا ایک ایک لفظ صداقت اور انسانیت پر مبنی ہے۔ اس تقریر میں مغرب کے سامراجی عالمی نظام کے مقابلے میں ایک انسانیت نواز نئے عالمی نظام کے اشارے پوشیدہ ہیں۔ اس تقریر سے واضح ہو جاتا ہے کہ اقبال مشرق و مغرب اور اسلامی و مغربی تہذیبوں کے درمیان ایک مکالمہ اور توازن کی فضا قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا تصادم سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ ان کے افکار میں خفیف ترین سطح پر بھی کوئی ایسا اشارہ نہیں ملتا جسے اسلام اور عیسائیت یا اسلامی اور مغربی تہذیب کی جنگ یا تصادم کا نام دیا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں اسلامی اور مغربی تہذیبوں کے تقابلی مطالعے کا ہر زاویہ بین التہذیبی ہم آہنگی، اتحاد، اشتراک، ایک دوسرے سے استفادے اور مکالمے کی طرف رُخ کرتا ہے۔ وہ ایک ایسی عالمی تہذیب کی بات کرتے ہیں جس میں تہذیبوں کی جنگ کی بجائے تہذیبوں کے اشتراک و اتحاد کا روشن اور وسیع المشرب تصور اُبھرتا ہے اور اسی تصور کے پس منظر میں اقبال کے افکار کو اور اقبال کے افکار کے حوالے سے اسلام کے افکار کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اسی تصور کے پس منظر میں اقبال

کے معاشرتی وتہذیبی افکار کی اور اقبال کے حوالے سے اسلام کے تہذیبی افکار کی معنویت اُبھرتی ہے۔ یہاں اس پیغام کا یہ اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

''تمام دنیا کے ارباب فکر دم بخود سوچ رہے ہیں کہ تہذیب وتمدن کے اس عروج اور انسانی ترقی کے اس کمال کا انجام یہی ہونا تھا کہ انسان ایک دوسرے کے جان ومال کے دشمن بن کر کرۂ ارض پر زندگی کا قیام ناممکن بنادیں۔ دراصل انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام [redacted] ہے اور جب تک تمام دنیا کی عالمی قوتیں اپنی توجہ کو احترامِ انسانیت کے درس پر مرکوز نہ کردیں یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی بنی رہے گی..... وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے جو رنگ ونسل و زبان سے بالاتر ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی، اس ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو مٹایا نہ جائے گا، جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے ''الخلق عیال اللہ'' کے اصول کا قائل نہ ہوجائے گا، جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ ونسل کے اعتبارات کو مٹایا نہ جائے گا اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح وسعادت کی زندگی بسر نہ کرسکیں گے۔ اور اخوت، حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندۂ تعبیر نہ ہوں گے۔''(۷)

اقبال کے نزدیک آدمیت یہی ہے کہ آدمی کا احترام کیا جائے۔ وہ اس تمام کرۂ ارض کو امن وسلامتی کا گہوارہ اور تمام انسانوں کے لیے ایک کشادہ اور خوبصورت گھر کی حیثیت سے [redacted] چاہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ مشرق ومغرب اور اسلامی ومغربی تہذیب دونوں میں ایک توازن کے قائل تھے نہ کہ تصادم کے۔ انہوں نے اسلام کے آفاقی اصولوں اخوت، مساوات اور حفظ نوع انسانی کے حوالے سے کوشش کی ہے کہ ایک طرف تو یہ تہذیبیں اپنی اپنی انفرادیت برقرار رکھیں دوسری طرف ہر قسم کی غلط فہمیوں اور تنگ نظری وتعصب سے نکل کر امن ومحبت، باہمی رواداری، انسانی حقوق کی بالادستی، بین المذاہب ہم آہنگی، تہذیبی سنگم اور بقائے باہمی کی طرف لوٹ آئیں اور اس کا حل یہی ہے کہ انسان انسان کے احترام کو اپنا شعار بنالے۔

اقبال نے اسلامی اور مغربی تہذیبوں کا تجزیہ سیاسی بنیادوں پر یا کسی

سامراجی اقتدار کی سیاست سے وابستہ ہو کر نہیں کیا بلکہ غیر جانبدارانہ انداز میں اصولی وفکری بنیادوں پر کیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ انہوں نے مسلمان ہونے کے ناتے مغرب کی ہر قدر کو قابل نفرت ٹھہرایا ہو۔ بلکہ انہوں نے اسلام کی موجودہ تہذیب اور مغرب کی جدید تہذیب دونوں کے معائب اور محاسن کو واضح کیا ہے چنانچہ ان کے ہاں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں:

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے مے خانے
یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صبا

(بالِ جبریل/کلیاتِ اقبال اردو، ص ۳۶/۳۶۰)

اقبال نے دراصل دونوں کی خوبیوں اور خامیوں کو سامنے رکھ کر ایک دوسرے کو آئینہ دکھایا ہے۔ ان کا مطمح نظر یہ ہے اہل مغرب اور اہل اسلام دونوں ایک دوسرے کی خوبیوں اور خامیوں پر نظر رکھ کر ایک دوسرے سے بات چیت کے ذریعے، ایک دوسرے سے مکالمے کے ذریعے استفادہ کریں تاکہ انسانی تہذیب کے یہ دونوں حصے انسانی زندگی کی فلاح و بہبود کے لیے ایک ہی وحدت کے طور پر کام کریں۔

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا تقاضا ہے کہ ہر شب کو سحر کر

(ضربِ کلیم/کلیاتِ اقبال اردو، ص ۱۲۱/۶۲۱)

اس کا مطلب یہ ہوا اقبال تہذیبی تکثیریت کے قائل ہیں لیکن اس تہذیبی تکثیریت میں مختلف تہذیبیں تصادم اور مناقشت کا شکار نہیں ہوتیں بلکہ ایک دوسرے سے استفادے کے ذریعے ایک ایسی آفاقی تہذیب کو جنم دیتی ہیں جس کی بنیاد اخوت اور انسانی وحدت پر ہے۔

اقبال نے مغرب کے منفی عناصر یعنی مادہ پرستی، اخلاق و مذہب سے دوری، مجرد عقلیت، استحصالی نو آبادیاتی نظام، مظلوم اور بدحال اقوام پر ظلم و استبداد اور جمہوریت کے پردے میں آمریت وغیرہ پر تنقید کی ہے اور انہی عناصر کی بنا پر مغربی تہذیب کے زوال کی نشاندہی کی ہے۔ تو دوسری طرف مشرق اور اسلامی تہذیب میں پیدا ہو جانے والی کاہلی، حیات

گریز تصوف، مغرب کی اندھی تقلید، سائنسی وعملی ترقیوں سے دوری، ملوکیت، ملائیت اور خانقاہیت وغیرہ کی بھی مذمت کی ہے۔ اسی طرح مغرب کی علمی وسائنسی ترقیوں، قوت اور شان وشوکت کے وہ قائل ہیں لیکن جب یہی قوت اور ترقی جسمانی لذت وتخریب کاری کی طرف مائل ہوتی ہے تو اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ دوسری طرف مشرق اور اسلامی تہذیب کی روحانیت، اخلاق، محبت، حیا، پاکیزگی وہ سراہتے ہیں۔ تہذیبوں پر تنقید کا یہ انداز کسی بندھے ٹکے فارمولے کے تحت نہیں ہیں بلکہ اس کے پیچھے حقیقت کی تلاش اور میل جول کا جذبہ کام کر رہا ہے۔ اقبال نے دونوں تہذیبوں کے مثبت اور منفی عناصر کی نشاندہی کر کے دونوں کو ایک دوسرے کے مثبت عناصر قبول کرنے کی دعوت دے کر ایک خوشگوار تعلق اور مکالمے کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ دراصل اقبال اس دنیا کو تمام انسانیت کا گھر تصور کرتے ہیں۔ فساد چاہے مغرب میں ہو یا مشرق میں، مسلمانوں کی وجہ سے ہو یا غیر مسلموں کی وجہ سے، وہ اس کے سخت مخالف ہیں۔ یہی وجہ ہے اقبال نے جہاں مغرب کی استعماری اغراض اور حکمت کے پنجۂ خونیں پر زبردست تنقید کی ہے وہاں پسماندہ اقوام کی جہالت، کم علمی اور بے عملی کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ جہاں انہوں نے کمزور اقوام کو مغرب کی سائنسی ترقی سے استفادہ کرنے پر زور دیا ہے وہاں مغرب کو بھی مشرق کی الہامی بنیادوں سے استفادہ کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج ایک دوسرے سے استفادے اور افہام وتفہیم کا یہی لچکدار روّیہ اتحادِ انسانیت کی فضا پیدا کرسکتا ہے اور ایسے مشترکہ اور منصفانہ عالمی نظام کی تخلیق کرسکتا ہے جس کی بنیاد اخوت و مساوات اور وحدتِ انسانی پر ہو۔ جس میں اقوام اپنے مسائل کو مکالمے کے ذریعے حل کرسکیں۔ اقبال کا یہی وہ عالمی نظام ہے جس میں کرۂ ارض کے تمام باشندے ایک وحدت میں ڈھل کر اجتماعی فلاح وبہبود کے لیے کوشش کرسکتے ہیں اور ایک ایسا عالمِ نو وجود میں لاسکتے ہیں جہاں کسی بھی فساد، کسی بھی اختلاف کا حل مل جل کر نکالا جاسکے۔

اقبال نے اسلامی اور مغربی تہذیب میں اصولی اور بنیادی طور پر پائے جانے والے مقاماتِ اتصال کی بھی نشاندہی کی ہے اور افتراقات کی بھی۔ مثلاً مغربی تہذیب مادیت وعقلیت

کی پیداوار ہے اور الہامی بنیاد سے محروم ہے جبکہ اسلامی تہذیب الہامی بنیاد سے وابستہ ہے اور مادے کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کرتی۔ اسی طرح مغربی تہذیب کے بعض پہلو اقبال کی نظر میں اسلامی تہذیب ہی کی ترقی یافتہ شکل ہیں (۸) بالفاظِ دیگر اسلام اور مغرب میں کچھ مشترک پہلو بھی موجود ہیں مثلاً سائنسی علوم اور حکمت کے پہلو۔ مطلب یہ ہوا کہ اقبال اسلام اور مغرب کے افتراق و انتشار کا ذکر ضرور کرتے ہیں لیکن اس کا مقصود کسی تصادم یا ٹکراؤ کو ہوا دینا نہیں ہے بلکہ متصادم اور مشترک پہلوؤں کو اُبھار کر سامنے لانے کا مقصد یہ ہے کہ دونوں تہذیبیں اپنے تمام پہلوؤں اور عناصر سے آگاہ ہو کر ایک جیسی خصوصیات کا لحاظ کرتے ہوئے رواداری، لچک بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ محبت کا مظاہرہ کریں اور اختلافی مسائل کو جنگ وجدل کی بجائے پرامن گفت وشنید کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کریں۔ اس طرح وہ اپنا اپنا نقطۂ نظر ایک دوسرے کے سامنے پیش کر کے محبت اور خلوص کے ساتھ بات چیت کے ذریعے اپنے فطری امتیازات یا تشخص کو بھی برقرار رکھ سکتی ہیں اور مشترک خواص کی بنا پر اتحاد اور مفاہمت، انسانیت اور رواداری، جیو اور جینے دو کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے ایک دوسرے کے درمیان ایک پل یا رابطہ بھی استوار کر سکتی ہیں۔ یہی ''تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ'' کا مقصود ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر جاوید اقبال نے کہا ہے کہ:

''مغربی تہذیب کو اسلامی تہذیب کی توسیع قرار دے کر وہ مغرب اور اسلام کے درمیان ایک پل یا رابطہ استوار کرنے کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔'' (۹)

اقبال کے نزدیک احترامِ آدمیت کا عمل اس وقت مکمل ہوگا جب تہذیبوں کے فطری امتیازات بھی برقرار رہیں (جو کہ ان کا حق ہے) اور ان میں مفاہمت و اتحاد بھی پیدا ہو جائے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب ہمیں معلوم ہو کہ ہمارے فطری امتیازات کون سے ہیں اور اشتراکات کون سے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال دونوں تہذیبوں کے متصادم و متحارب اور مشترک و متصل خواص کو تفصیل کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں جو اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ ان کا تجزیہ ہنگامی بنیادوں پر نہیں بلکہ ٹھوس اور گہرے فکری دلائل پر استوار ہے اور نیک نیتی پر مبنی

ہے۔

اقبال کی تہذیبی تکثیریت، رنگا رنگی اور پرامن بقائے باہمی پر یقین رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مسلمان ممالک اور مغربی ممالک ایک دوسرے کے درمیان دوستانہ تعلقات استوار کریں۔ وہ اپنے متنازعہ سیاسی اور معاشی حل کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ عسکری تصادم کے بجائے مذاکرات اور بات چیت کو ترجیح دیں۔ اقبال کو معلوم ہے تہذیبی اکثریت گروہوں کی فطری اور نفسیاتی ضرورت بھی ہے اور کائناتی ارتقا کا وسیلہ بھی۔ لیکن ایسی تہذیبی تکثیریت ہی انسانی وحدت کو جنم دے سکتی ہیں جس میں نفرت اور رقابت کی بجائے اشتراکِ عمل اور مکالمے کا پہلو پایا جائے۔ مغرب تہذیبی تکثیریت کی جو صورت پیش کرتا ہے وہ بالآخر مغرب کی سامراجی آفاقیت میں ڈھل جاتی ہے اور اقبال کے نزدیک یہ سامراجی آفاقیت فتنہ و فساد، تنازعہ اور تصادم کو ہوا دیتی ہے۔

اقبال نے نہ صرف مغربی تہذیب کو اسلامی تہذیب کی ترقی یافتہ شکل قرار دیا ہے بلکہ مغرب کے حقیقی جوہر کو پہچاننے اور اس کا ناقدانہ بصیرت کے ساتھ جائزہ لینے کی تلقین کی ہے۔(۱۰) اسی طرح مغرب کو بھی اسلامی تہذیب سے استفادہ کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ اِس دو طرفہ عمل کے ثبوت کے لیے محض پیامِ مشرق کا سرورق (**للّٰہ المشرق والمغرب**) اور دیباچہ ہی کافی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال اسلام اور مغرب میں تنازع کے نہیں بلکہ کچھ لو اور کچھ دو کے اصول کے تحت ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو پرامن لین دین کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک اہل اسلام اور اہل مغرب دونوں کے مستقبل کا انحصار افہام و تفہیم پر ہے کہ دونوں تہذیبیں ایک دوسرے کو کچھ سکھاتے ہوئے آگے بڑھیں۔ ہنٹنگٹن نے لیسٹر پیئرسن (Lester Pearson) کے حوالے سے چند سطور نقل کی ہیں جو یہاں پیش کی جاتی ہیں۔ ان کے حوالے سے اقبال کے پیغام کی اہمیت ہمارے زمانے میں اور بھی نکھر کر سامنے آتی ہے۔

''۱۹۵۰ء کی دہائی میں لیسٹر پیئرسن نے خبردار کیا کہ انسان ایک ایسے زمانے میں داخل ہو رہا ہے جہاں مختلف تہذیبوں کو ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو پرامن لین دین کے ساتھ

ایک دوسرے سے سیکھتے ہوئے، ایک دوسرے کی تاریخ اور آدرشوں اور فن وثقافت کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک دوسرے کی زندگیوں کو زرخیز بناتے ہوئے زندگی بسر کرنا سیکھنا ہوگا۔ اِس پرہجوم چھوٹی سی دنیا میں دوسرا راستہ کشیدگی، تصادم اور آفات کا ہے۔ امن اور تہذیب دونوں کے مستقبل کا انحصار دنیا کی بڑی تہذیبوں کے سیاسی وروحانی اور علمی رہنماؤں کے درمیان افہام وتفہیم اور تعاون پر ہے۔'' (۱۱)

کیا یہ وہی باتیں نہیں ہیں جو اقبال نے ۱۹۵۰ء سے پہلے کہی تھیں، وہی تہذیبی تکثیریت اور تعاون واتحاد کا نقطۂ نظر۔

اس سلسلے میں اسلام اہم ترین کردار ادا کرسکتا ہے اس لیے کہ اقبال کے نزدیک اسلام اپنی ماہیت میں نہ تو کوئی قومی مذہب ہے نہ نسلی وموروثی بلکہ یہ خالصتاً ایسا دین ہے جس کی بنیاد انسانی ہے۔ ایک تہذیب کی حیثیت سے اس کی کوئی مخصوص جغرافیائی حیثیت، زبان، رنگ یا معاشرت نہیں۔ اسلام میں سب انسان برابر ہیں۔ اسلام انسانی مساوات، اخوت اور حریت کی بنیادوں پر قائم ہے۔ اسلام ہی وہ دین ہے جس کا ''مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالمِ بشریت کو متحد ومنظم کرنا ہے۔'' (۱۲)

''بالفاظِ دیگر یوں کہیے کہ بنی نوع انسان کے اقوام کو باوجود شعوب وقبائل اور الوان والسنہ کے اختلافات کو تسلیم کرنے کے ان کو ان تمام آلودگیوں سے منزہ کیا جائے جو زمان، مکان، وطن، قوم، نسل، نسب، ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں۔ اور اس طرح سے اس پیکر خاکی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ابدیت سے ہمکنار ہو۔'' (۱۳)

اس طرح اسلام تہذیبوں کی اکثریت کو قبول کرتا ہے اور اکثریت کے باوجود انہیں انسانی بنیادوں پر اس طرح متحد کرتا ہے کہ ایک صحیح انسانی عالمی نظام وجود میں آجاتا ہے۔ اقبال کے نزدیک عہد جدید میں مذہب کے اسی ارفع تصور کی ضرورت ہے۔ اسی تصور کو اپنانے سے انسان اپنے مذہب سے وابستہ رہتے ہوئے دوسرے انسانوں کے مذاہب اور تہذیبوں کا احترام

کرسکتا ہے۔ بقول ڈاکٹر جاوید اقبال، علامہ اقبال نے مذہب کا یہ ارفع تصور قرآن کی سورۃ ۵ آیت ۴۸ سے اخذ کیا ہے(۱۴) جس کا ترجمہ یہ ہے:

''ہم نے تم سب کے لیے ایک ایک شریعت اور راستہ رکھا اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب ایک ہی مذہب کی اُمّت ہوتے (لیکن اس نے ایسا نہیں چاہا) تاکہ تم کو جو کچھ دیا گیا ہے اس پر تم کو آزمائے۔ پس نیک کاموں میں ایک دوسرے سے سبقت لینے کی سعی کرو۔ بالآخر تم سب نے اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے اور وہ تمہیں بتائے گا کہ تمہارے آپس میں اختلافات کیا تھے۔''

انہی تعلیمات سے متاثر ہوکر اقبال نے ''روحانی جمہوریت'' کا تصور پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک اسلامی ریاست کی اصل غرض و غایت ''روحانی جمہوریت'' کا قیام ہے جس کا مطلب ہے کہ ایسی ریاست جو استحکامِ انسانیت کے ساتھ ساتھ ہر مذہب، عقیدے اور مسلک کی آزادی و احترام کو ملحوظ رکھے۔ لیکن اقبال کو افسوس ہے کہ فی الحال ایسا ممکن نہیں کیونکہ انسان کی خودی پہ مرگ طاری ہوچکی ہے۔ مشرق، اسلامی مشرق اور مغرب سب خودی کی موت سے جذام اور تاریکی کا شکار ہیں۔

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور
خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام
خودی کی موت سے روحِ عرب ہے بے تب و تاب
بدن عراق و عجم کا ہے بے عروق و عِظام
(ضربِ کلیم/کلیاتِ اقبال اردو، ص۹۳/۵۹۳)

نہ مشرق اس سے بَری ہے، نہ مغرب اس سے بَری
جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری
(ضربِ کلیم/کلیاتِ اقبال اردو، ص۱۷۲/۶۷۲)

ان حالات میں اقبال کے نزدیک اسلام اور مغرب اور اس کے ساتھ ساتھ پورے

عالمِ انسانیت کی بقا کا انحصار اتحادِ آدم پر ہے جو مذہب کے زندہ اور ارفع تصور کو اپنانے ہی سے ممکن ہے جس میں انسانیت کی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے تہذیبوں کی اکثریت کو قبول کیا گیا ہو، ان کے فطری امتیازات کو قائم رکھتے ہوئے ان میں امتزاج و ارتباط اور وحدت پیدا کردی ہو۔ اس سلسلے میں نہ مشرق اور موجودہ اسلامی تہذیب پر اعتماد کیا جاسکتا ہے اور نہ مغرب پر۔ کیونکہ مشرق سراسر افسانہ بن چکا ہے۔ مسلمان اپنے حقیقی افکار کو کھو بیٹھے ہیں۔ اور مغرب خدا سے بیگانہ ہے، اس کی فکر ہی فاسد ہے صرف حقیقی اسلام اور اس سے وابستہ تہذیب ہی اپنے اخلاقی اور ارفع و اعلیٰ اصولوں کی بنا پر اس قسم کی مطلوبہ آفاقی تہذیب پیدا کرسکتے ہیں۔

مغرب ز تو بیگانہ ، مشرق ہمہ افسانہ
وقت است کہ در عالم نقشِ دگر انگیزی

(زبورِ عجم/کلیاتِ اقبال فارسی، ص ۸/۴۰۰)

اقبال فرماتے ہیں:

''عالمِ انسانیت کو آج تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ کائنات کی روحانی تعبیر، فرد کا روحانی استخلاص اور وہ بنیادی اصول جن کی نوعیت عالمگیر ہو اور جن سے انسانی معاشرے کے ارتقا روحانی اساس پر ہوتا رہے۔'' (۱۵)

یہ تینوں چیزیں پیدا کرنے میں مغربی تہذیب بھی ناکام ہوچکی ہے اور عالمِ اسلام میں بھی کوئی ایک گوشہ، ملک یا معاشرہ ایسا نہیں جسے اِس عمل میں کامیابی ہوئی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان ملوکیت، ملائیت، خانقاہیت اور مغربی استبداد کی وجہ سے اسلام کے بنیادی، حرکی اور انقلابی تصورات سے محروم ہیں اور ان تصورات کی انقلابی و حرکی نوعیت کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔ تاہم اسلام سے وابستہ بھی مسلمان ہی ہیں اس لیے یہ ان کا فرض بنتا ہے کہ وہ اسلام کے حقیقی افکار کو سمجھتے ہوئے ان کے ذریعے نہ صرف اسلام اور مغرب میں مکالمے کی کوشش کریں بلکہ عالمگیر مساوات کے لیے قدم اٹھائیں۔ اسی لیے اقبال نے مسلمانوں کو ایک نیا مسلم معاشرہ وجود میں لانے کی تلقین کی ہے ان کے نزدیک:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ جدید یورپ نے اسی نہج پر متعدد عینی نظام قائم کیے، لیکن تجربہ کہتا ہے کہ جس حق و صداقت کا انکشاف عقل محض کی وساطت سے ہے اس سے ایمان ویقین میں وہ حرارت پیدا نہیں ہوتی جو وحی تنزیل کی بدولت ہوتی ہے...... لہٰذا یورپ کے عینی فلسفے کو کبھی یہ درجہ حاصل نہیں ہوا کہ زندگی کا کوئی مؤثر جزو بن سکے۔ اس لیے اب یہ حالت ہے یورپ کی فسادزدہ خودی باہم دیگر حریف جمہوریتوں کی شکل میں، جن کا مقصد وحید یہ ہے کہ ِلت مندوں کی خاطر ناداروں کا حق چھینے، اپنے تقاضے پورے کر رہی ہے۔ یقین کیجیے یورپ ے بڑھ کر آج انسان کے اخلاقی ارتقا میں بڑی رکاوٹ کوئی نہیں برعکس اس کے...... ہماری جگہ ا کی ان قوموں میں ہونی چاہیے جو روحانی اعتبار سے سب سے زیادہ استخلاص حاصل کر چکی ،...... ہمیں چاہیے کہ آج اپنے اس مؤقف (خاتمیت) کو سمجھیں اور اپنی حیاتِ اجتماعیہ کی ایل اسلام کے بنیادی اصولوں کی رہنمائی میں کریں تا آنکہ اس کی وہ غرض و غایت جو ابھی ،صرف جزواً ہمارے سامنے آئی ہے، یعنی اس روحانی جمہوریت کا نشوونما جو اس کا مقصود اما ہے، تکمیل کو پہنچ سکے۔'' (۱۶)

ا یہی وجہ ہے کہ اقبال مغرب کی علمی وتخلیقی تحسین کے باوجود اسلام ہی سے روشنی ل کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے پاس قرآن اور اسلام کی صورت میں ایک نظریاتی اور روحانی موجود ہے جو وحدتِ انسانی اور تہذیبی سنگم کا درس دیتی ہے جبکہ مغرب اس سے محروم ہے۔ کے نزدیک اسلام ہی آفاقی تہذیب کی راہ ہموار کرسکتا ہے۔ اسلام کو وہ صرف مسلمانوں کی یب نہیں سمجھتے بلکہ انسانی تہذیب قرار دیتے ہیں۔ اس تہذیب کی ترکیب میں مشرق کی نیت واخلاقیت اور مغرب کی مادیت وعقلیت سب کچھ موجود ہے۔ اس میں مشرق بھی ہے ب بھی۔ اس میں عربی، ایرانی، ہندی، ترکی، یورپی، امریکی تمام رنگ ایک توازن کے ساتھ ود ہیں۔ اس میں تمام تہذیبوں اور ان میں فطری امتیازات کے باوجود اتحاد و اتفاق کی ائش ہے۔ اسلام کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ ایک ایسا عالمگیر معاشرہ تشکیل دیا جائے جس میں م دنیا کی قومیں اتحاد و یکجہتی کے ساتھ رہیں اور پرامن زندگی بسر کرسکیں۔ ہر قوم دوسری قوم

کے مذہبی اور تہذیبی امور میں رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان میں کسی قسم کی دخل اندازی نہ کرے بلکہ پرامن طور پر رہتے ہوئے اپنے اپنے مذہب کا پرچار کرے تاکہ جسے جو مذہب پسند آئے وہ اسے اختیار کرلے۔ اسلام تمام بنی نوعِ انسانی کو ایک خاندان تصور کرتا ہے اور سب کو آدم کی اولاد قرار دیتا ہے۔ اسلام کی اساسی دعوت ہی یہ ہے کہ سب بھائی بھائی بن کر ''جیو اور جینے دو'' کے اصول پر کاربند ہوجائیں۔ اس لیے اقبال کے نزدیک ضروری ہے کہ روحِ اسلام کو درست انداز میں پیش کیا جائے۔ اقبال کے خیال میں اسلام ہی وہ تہذیب ہے جو ایک طرف تو قوموں کی تہذیبی انفرادیت کو برقرار رکھتا ہے دوسری طرف قوموں کے درمیان ہر قسم کی غلط فہمیوں اور لڑائی جھگڑے کو دور کرکے امن اور تہذیبی سنگم کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ مغربی تہذیب اپنے فکری فساد، استعماری روش اور لادین یلغار کی وجہ سے ان کے لیے قابل اعتراض ہے لیکن اسلام کے اخلاقی اصول حریت ومساوات، اتحادِ انسانی، جمہوریت، امن وامان، انسانی حقوق کی بالادستی اور باہمی رواداری کے حامل ہیں۔ یہ اقدار اور اصول قوموں کے نفسیات اور فطرت کے مطابق ہیں۔ اقبال اس سلسلے میں ذات پات، ملک وملت، نسل وزبان اور نظریہ وعقیدہ کی بجائے عام انسانی، اصولی اور آفاقی نقطۂ نظر اختیار کرتے ہیں۔ انہوں نے محدود زاویۂ نظر اختیار کرنے کی بجائے پوری دنیائے انسانیت اور عصر حاضر کے عام تہذیبی رجحانات پر آفاقی زاویے سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ خود مسلمان اس سے بیگانہ ہوں یا مغرب اور دوسری اقوام اس کو تعصب کی بنا پر تسلیم نہ کریں۔ یہ بات عقیدے، زبان، نسل اور مسلک کی نہیں بلکہ صرف نظریے، اصول اور عمل کی ہے۔

زمانہ ایک ، حیات ایک ، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری ، قصۂ جدید و قدیم

(ضربِ کلیم/کلیاتِ اقبال اردو، ص ۳۸/۵۳۸)

اقبال اسلامی اصولوں کی روشنی میں تہذیبی تکثیریت اور اس تکثیریت میں اتحاد واتفاق کے ذریعے تہذیبی آفاقیت کے قائل ہیں اسی بنیاد پر وہ اسلام اور مغرب میں مکالمہ کر

چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اسلام اور مغرب بلاشبہ اپنے فطری امتیازات یا (خودی) کو قائم رکھیں لیکن غیر ضروری امتیازات اور اختلافات بات چیت کے ذریعے دور کر کے پرامن بقائے باہمی اور احترامِ آدمیت کے اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مل جل کر زندگی گزاریں۔ اسی میں ان کی بقا اور ترقی ہے۔ اپنے اپنے امتیازات اور انفرادیت قائم رکھتے ہوئے ایک آفاقی تہذیب کی تخلیق عہدِ جدید کے تقاضوں کے عین مطابق بھی ہے، اسلامی و مغربی تہذیبوں کی لازمی ضرورت بھی اور اقبال کی تصورِ خودی کے عین مطابق بھی۔ لیسٹر پیئرسن کا بیان پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ اب آلِ احمد سرور کا یہ بیان دیکھیں:

''یہ بات اب عام طور پر تسلیم کی جانے لگی ہے کہ ہر تہذیب مخصوص جغرافیائی، تاریخی، تہذیبی حالات میں وجود میں آتی ہے اور کوئی ایک ماڈل بجنسہٖ دوسری تہذیبوں اور سماجوں پر منطبق نہیں کیا جا سکتا۔ ہر تہذیب اور ہر سماج کو اپنا وجود برابر دریافت کرنا ہوتا ہے، اپنے باطن میں جھانکنا ہوتا ہے، اپنی انفرادیت اور اپنی شناخت کو پانا ہوتا ہے، اسی بنیاد پر وہ عالمی میلانات کے مطابق تعمیر کر سکتی ہے۔ اسی خصوصیت کے ذریعے وہ آفاقیت کا جزو بن سکتی ہے۔''(۱۷)

آفاقیت کا یہ تصور مغربی آفاقیت کے تصور سے بہت مختلف ہے جو تمام تہذیبوں کو اپنے رنگ میں رنگنا چاہتی ہے اور جس کا نتیجہ آج بالخصوص اسلام سے تناؤ کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ اس لیے کہ اسلام خود ایک مستحکم تہذیب ہے۔ پھر دونوں تہذیبوں سے وابستہ اقوام کو اپنی اپنی تہذیبوں سے جذباتی لگاؤ بھی ہے اس لیے امن و امان کا واحد حل یہی ہے کہ دونوں کے وجود کو تسلیم کیا جائے اور دونوں کو پنپنے کا موقع دیا جائے۔ اقبال کے افکار سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''یہی وہ موزوں اور مناسب وقت ہے جب مسلم ممالک میں امریکا اور اس کے اتحادیوں کے خلاف پائی جانے والی نفرت اور غم و غصے کا تدارک ممکن ہے۔ مسلم ممالک کو اپنے ان مغربی حلیفوں کو اس مسئلے کے حل کے لیے بہتر انداز میں قائل کرنا چاہیے۔ مغرب کی غیر

دانشمندانہ پالیسیوں کے نتیجے میں مسلمانوں کو اسرائیل، کوسووو، چیچنیا، بوسنیا اور کشمیر میں جن نامساعد حالات کا سامنا ہے اگر اس کے لیے منصفانہ طرزِ عمل اختیار کیا جائے تو نہ صرف غم و غصے کی لہر ختم ہوسکتی ہے بلکہ ایک ایسی کثیر الاقوامی دنیا وجود میں آسکتی ہے جہاں بات چیت اور مذاکرات کے ذریعے سے امن اور انصاف کا حصول ممکن ہوسکتا ہے۔'' (۱۸)

اقبال کے نزدیک اسلام اور مغرب ایک ہی کرۂ ارض کے دو ناگزیر اجزاء ہیں۔ اس لیے اقبال چاہتے ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کی ضروریات کا احترام کرتے ہوئے اپنے آپ کو مستحکم کریں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے جہاں مسلمانوں کو بیدار ہونے، خود داری اختیار کرنے اور اسلام کی حقیقی روح کو سمجھنے کی تلقین کی ہے وہاں مغرب کو بھی آدم شناسی اور حقوقِ انسانی کی پاسداری کی نصیحت کی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ کرۂ ارض کے یہ دونوں اجزاء مل کر فلاحِ انسانیت کے لیے کام کریں اور جہاں کہیں تاریکی یا فساد ہے اسے ختم کرکے دنیا کو امن وسلامتی کا گہوارہ بنائیں۔ اقبال کے نزدیک اسلام اور مغرب میں مکالمے اور اتحاد کا طریقہ یہی ہے کہ مشترک خواص کی نشاندہی کرکے ان اسباب اور عناصر کا خاتمہ کیا جائے جن کی وجہ سے غم و غصہ کی لہر پیدا ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اقبال نے مغربی تہذیب کے مختلف پہلوؤں کو اسلامی تہذیب کی توسیع قرار دیا ہے کہ اسلامی اور مغربی تہذیب کے بنیادی عناصر میں فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کو رواداری کا سبق سکھایا جائے اور اس طرح سے دونوں کی تشکیل جدید کی جائے، امن، مساوات، بھائی چارے، جمہوریت اور انسان دوستی کے ارفع اصولوں کی بات کی جائے۔ دونوں تہذیبوں کے اصلی عناصر اس طرح واضح کیے جائیں کہ ایک طرف تو دونوں اپنا اپنا تشخص قائم رکھیں دوسری طرف بین التہذیبی ہم آہنگی اور انسانیت کے اعلیٰ مدارج کی طرف بھی لوٹ آئیں۔ یہ دونوں تہذیبیں تہذیبی اکثریت پر یقین رکھیں اور اس کے ساتھ ساتھ پرامن بقائے باہمی کے اصولوں کو فروغ دیں۔ ایک دوسرے کے اچھے اور مفید اجزاء کو کشادہ دلی سے جذب کریں اور منفی یا مضر اجزاء کی نشاندہی کرکے انہیں دور کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کریں یوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ترقی کی طرف گامزن ہوں۔

یہ کرۂ ارض ایک ہی ہے لیکن تہذیبیں اور اقوام کثیر ہیں۔ اقبال چاہتے ہیں کہ نہ صرف اسلام اور مغرب بلکہ یہ تمام کثیر تہذیبیں اور کثیر اقوام اچھے ہمسایوں کی طرح رہیں۔ سب اپنے آپ میں وسیع النظری اور صلح کل کی صفات کو فروغ دیں، رواداری اور قوتِ برداشت پیدا کریں۔ اختلافات کو بات چیت کے ذریعے دور کریں۔ ایک دوسرے کے دکھ درد اور خوشیوں میں شریک ہوں۔ علوم وفنون کو فلاحِ عامہ کے لیے استعمال کریں۔ انسان چاہے اسلامی تہذیب سے وابستہ ہو یا مغربی تہذیب سے یا کسی اور تہذیب سے، سب کو فکر یہ کرنی چاہیے کہ نسل انسانی جس زمین پر رہتی ہے وہ سب کے لیے کشادہ ہو۔ نفرت، تنگ نظری، تعصب، خودغرضی، مفاد پرستی اور تشدد کے سبب بودوباش کے لیے یہ زمین تنگ نہ ہونے پائے۔ اس زمین کے وسائل محدود ہیں اور انسان بہت زیادہ ہیں اس لیے ہر کسی کو اس کا حق فراہم کیا جائے۔ اس کرۂ ارض پر نہ صرف اسلامی اور مغربی تہذیبوں کو بلکہ تمام تہذیبوں کو ایک دوسرے کے ساتھ پرامن لین دین کرنا ہوگا، ایک دوسرے سے سیکھنا ہوگا، ایک دوسرے کے وجود کو صحت مند اور ایک دوسرے کی زندگیوں کو زرخیز بنانا ہوگا۔ اس کے برعکس دوسرا راستہ تباہی اور تصادم کا ہے۔ یہی ''عالمِ قرآنی'' ہے جو احترامِ آدمیت سے عبارت ہے، جس کی اساس آفاقی اور ابدی اصولوں پر ہے، جو ''بے امتیاز خون ورنگ'' ہے۔ لیکن یہ عالم ابھی تک وجود میں نہیں آسکا اور ہم ابھی تک ایک ''فرسودہ عالم'' میں مقیم ہیں۔(۱۹)

تاہم یہ عالم وجود میں آسکتا ہے۔ آج یہ کام بہت اچھے طریقے سے سرانجام دیا جاسکتا ہے اس لیے کہ آج اقوام پہلے سے زیادہ ایک دوسرے کے قریب آچکی ہیں، فاصلے سمٹ گئے ہیں، طاقتور میڈیا موجود ہے، ٹیکنالوجی کی ترقی اور تیز رفتاری، ابلاغ کے فوری رابطوں اور کھلی سرحدوں کے سبب آج ایسا ممکن ہے کہ اس گلوبل ولیج کو حقیقت میں گلوبل ولیج بنا دیا جائے، دلوں میں اُٹھی ہوئی دیواروں کو گرادیا جائے، نہ مشرق سے بیزار ہوا جائے اور نہ مغرب سے حذر کیا جائے بلکہ مشرق ومغرب دونوں کو ملا کر ایک کردیا جائے۔ آج ایسا ممکن ہے کہ انسان اور تہذیبیں ایک دوسرے کی مدد کرسکیں، بہتری کی خاطر ایک دوسرے کی زندگیوں پر اثر

انداز ہوسکیں، ہزاروں میل دور ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مکالمہ کرسکیں، اپنا دکھ درد کہہ سکیں، مسائل بانٹ سکیں، امن اور تہذیب دونوں کے مستقبل کا انحصار اسی فہم وتفہیم اور تعاون پر ہے صرف آدمی کے مقام سے، آدمیت کے احترام سے باخبر ہونے کی ضرورت ہے۔

برتر از گردوں مقامِ آدم است
اصلِ تہذیب احترامِ آدم است
آدمیت احترامِ آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی

(جاوید نامہ/کلیاتِ اقبال فارسی، ص ۶۹، ۲۰۵/ ۶۵۷، ۷۹۳)

حواشی

[۱] مندرجہ بالا مباحث کے لیے ملاحظہ کیجیے:

جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۳۹۹، ۴۰۰؛

جاوید اقبال، ڈاکٹر، مئے لالہ فام، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۳۵، ۳۶؛

جاوید اقبال، ڈاکٹر، افکارِ اقبال۔ تشریحاتِ جاوید، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۱۳۷ تا ۱۳۹؛

عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، اقبال اور جدید دنیائے اسلام، مکتبۂ تعمیر انسانیت، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۲۴؛

ٹائن بی، مطالعہ تاریخ (حصہ دوم)، تلخیص، سومرویل۔ڈی۔سی، ترجمہ، مہر، غلام رسول، مولانا، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ۲۸۳، ۲۸۴؛

Huntington,"The Clash of Civilizations and the remaking of world order"Simon & Schuster, New York, 1997,PP.252

[۲] اقبال، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ (خطبۂ ہفتم)، ترجمہ، نذیر نیازی، سیّد، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۲۹۰

[۳] جاوید اقبال، ڈاکٹر، ''اقبال اور تہذیبوں کے درمیان مکالمے کی اہمیت''، مشمولہ ''اقبال مشرق ومغرب کی نظر میں''، مرتبہ، سوندھی
ٹرانسلیشن سوسائٹی، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۱۱۰، ۱۱۱

[۴] جاوید اقبال، ڈاکٹر، افکارِ اقبال۔ تشریحاتِ جاوید، ص ۱۴۱، ۱۴۲

[۵] ایضاً، ص ۱۴۲

[۶] ہنٹنگٹن اور فوکویاما کے خیالات کے لیے دیکھیے:

Huntington,"The Clash of Civilizations",see part iv,PP.311 312,20,21,109 to 124;

Fukuyama, Francis "The end of history?",(Article),The National Interest 16, Washington D.C., Summer 1989,PP.4,18;

Ibid. "The end of history and the last man",(Book), The Hearst Corporation, New York, 1992, PP.288,125

[۷] اقبال، حرفِ اقبال، مرتبہ، لطیف احمد شروانی، ایم ثناء اللہ خاں، انشا پریس، لاہور، ۱۹۵۵ء، ص ۲۲۴، ۲۲۵

[۸] اقبال، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ (خطبہ اوّل)، ترجمہ، نذیر نیازی، سیّد، ص ۱۱

[۹] جاوید اقبال، ڈاکٹر، ''اقبال اور تہذیبوں کے مابین مکالمے کی اہمیت''، مشمولہ ''اقبال مشرق و مغرب کی نظر میں''، مرتبہ، سوندھی
ٹرانسلیشن سوسائٹی، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور، ص ۱۰۹، ۱۱۰

[۱۰] اقبال، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ (خطبہ اوّل)، ترجمہ، نذیر نیازی، سیّد، ص ۱۱، ۱۲

11. Huntington,"Clash of Civilizations",PP.321;
Pearson,Lester,"Democracy in world Politics",Princeton University Press, Princeton,1955,P83.84

[۱۲] اقبال، مقالاتِ اقبال (جغرافیائی حدود اور مسلمان)، مرتبہ، عبدالواحد معینی، سیّد، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۲۶۶

[۱۳] ایضاً، ص ۲۷۶

[۱۴] جاوید اقبال، ڈاکٹر، افکارِ اقبال۔ تشریحاتِ جاوید، ص ۱۴۸

[۱۵] اقبال، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ (خطبہ ششم)، ترجمہ، نذیر نیازی، سیّد، ص ۲۷۵

[۱۶] ایضاً، ص ۲۷۵ تا ۲۷۷

[۱۷] سرور، آلِ احمد، دانشورِ اقبال، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۵۴، ۵۵

[۱۸] جاوید اقبال، ڈاکٹر، ''اقبال اور تہذیبوں کے مابین مکالمے کی اہمیت''، مشمولہ ''اقبال مشرق و مغرب کی

نظر میں''، مرتبہ، سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور، ص ۱۱۱

[۱۹] ''عالمِ قرآنی'' کے لیے ملاحظہ کیجیے:
جاوید نامہ/کلیاتِ اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۶۷ تا ۵۷/۶۵۵ تا ۶۶۳